ہجرتِ حبشہ

(۲)

مہاجرین کے ساتھ حبشہ میں سلوک ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ حبشہ قریش کی پرانی تجارت گاہ تھی جہاں وہ خوب رزق کماتے اور تجارت میں اچھے فائدے اٹھاتے تھے۔ اسی وجہ سے مہاجرین کو وہاں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ مہاجرین کا اپنا قول یہ ہے کہ ہم وہاں بہت اچھی طرح رہے، اپنے دین کے معاملہ میں پورے امن سے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، کوئی اذیت ہم کو نہ دی جاتی تھی اور نہ کوئی بات ہمیں ایسی سننی پڑتی تھی جو ہمیں ناگوار ہو۔

قریش کا وفد اُن کے پیچھے جاتا ہے قریش نے جب دیکھا کہ یہ لوگ حبشہ میں امن کے ساتھ ٹک گئے ہیں تو انھوں نے عَمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ نجاشی[1] کے پاس (جس کا نام بخاری میں اَصحَمہ لکھا ہے) بھیجا تاکہ انہیں واپس لائیں۔ لیکن نجاشی نے ان کی بات نہ مانی اور انہیں ناکام واپس کردیا۔ اس وفد کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں کے ساتھ عُمارہ بن ولید بن مُغیرہ کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اور بعض میں یہ ہے کہ عمرو بن العاص تو پہلی اور دوسری ہجرت، دونوں کے موقع پر نجاشی کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر پہلے وفد میں ان کے ساتھ عُمارہ تھا اور دوسرے وفد میں عبداللہ۔ مگر ابن اسحاق نے دونوں موقعوں پر عبداللہ ہی کا نام لیا ہے۔

مہاجرین کی واپسی اور اس کا سبب اسی سال رمضان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبر حبش میں مہاجرین کو اس شکل میں پہنچی کہ کفارِ مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں،

---

[1] نجاشی (NEGUS) شاہانِ حبشہ کا لقب تھا۔

جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبانِ مبارک پر سورۂ نجم جاری فرما دی۔ کلام کی شدّتِ تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپ نے اسے سُنانا شروع کیا تو مخالفین کو اُس پر شور مچانے کا ہوش تک نہ رہا، اور خاتمہ پر جب آپ نے سجدہ فرمایا تو سب حاضرین سجدہ میں گر گئے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ "یہ قرآن مجید کی پہلی سورۃ تھی جسے حضورؐ نے قریش کے مجمع عام میں (اور ابن مَردُویہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سُنایا تھا۔ مجمع میں کافر و مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپ نے آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیّہ بن خَلَف کو دیکھا کہ اُس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹّی اُٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا میرے لیے بس یہی کافی ہے"۔ اس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مطّلِبؓ بن ابی وَدَاعہ ہیں جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نسائی اور مُسندِ احمد میں ان کا اپنا بیان یہ نقل ہوا ہے کہ "جب حضورؐ نے سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا اور اسی کی تلافی اب میں اس طرح کرتا ہوں کہ اِس سورہ کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا"۔ ابن سعد نے واقدی کی سند سے بیان کیا ہے کہ ولید بن مُغیرہ نے بھی مٹھی بھر مٹّی اُٹھا کر اپنی پیشانی پر لگائی تھی، کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ سجدہ نہ کرسکتا تھا، اور ابواُحیحہ سعید بن العاص نے بھی اسی طرح مٹی اپنی پیشانی پر لگائی تھی کیونکہ وہ بھی بوڑھا تھا۔

اِس سے یہ خبر مشہور ہو کر حبشہ تک اس شکل میں پہنچی کہ مشرکینِ قریش مسلمان ہو گئے ہیں۔ مگر اصل صورتِ حال دوسری ہی تھی۔ قرآن کی شدّتِ تاثیر سے متاثر ہو کر سجدہ کرنے والے اُس وقت تو سجدہ کر بیٹھے۔ مگر بعد میں انہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی، اور لوگوں نے بھی اُن کو مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سُننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے کان لگا کر سُنا ہی نہیں بلکہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ساتھ سجدہ بھی کر لیا۔ آخر کار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہم نے تو اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی کے بعد محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تھے کہ تلك الغرانقۃ العلی وان شفاعتھن لترجی (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقّع ہے)، اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہمارے

طریقے پر آگئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ سورۂ نجم کے اِس سیاق و سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہوسکتی ہے جو ان کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے حضورؐ کی زبان سے سُنے ہیں۔

قصۂ غرانیق کی حقیقت لیکن افسوس یہ ہے کہ خود ہمارے ہاں کے مفسرین و محدثین میں بعض ایسی روایات مشہور ہوگئیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کفار نے حضورؐ کی زبان مبارک سے جو فقرے سُننے کا دعویٰ کیا تھا وہ فی الواقع حضورؐ ہی کی زبان سے نکلے تھے، اور اِس تمنا کی وجہ سے نکلے تھے کہ کسی طرح آپؐ کے اور کفار کے درمیان منافرت دُور ہو، اور شیطان نے آپ کی اِس تمنا سے فائدہ اُٹھا کر یہ کلمات آپ کی زبان پہ جاری کرا دیے تھے۔

قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہوجائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دُور ہو اور وہ کچھ قریب آجائیں۔ یا کم از کم ان کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انہیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپ نے اُسے پڑھنا شروع کیا۔ جب آپ اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی پر پہنچے تو یکایک آپ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، تلك الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجیٰ (یہ بلند دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس سے آگے پھر آپ سورۂ نجم کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتام سورۃ پر آپ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں ہے[۱] کہ وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ

[۱] ایک مغربی مستشرق نے کمال بددیانتی کے ساتھ یہ بات اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دی ہے کہ "وہ شیطانی آیتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ سورۂ نجم کی آیات ۲۱ تا ۲۳ نازل کر دیں" حالانکہ یہ قطعی بلا ثبوت بات ہے جس کے لیے کوئی حوالہ نہ اس مصنّف نے دیا ہے، نہ وہ دے سکتا ہے۔

لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ ...... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا۔" یعنی "اے نبیؐ، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو ...... پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔" یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی یہاں تک کہ سورۂ حج کی آیت ۵۲ نازل ہوئی جس میں آنحضرتؐ کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے کوئی تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سُن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرین حبشہ تک اس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ صلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کفر کی دشمنی جوں کی توں قائم ہے۔

یہ قصہ ابن جریر اور بہت سے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں، ابن سعد نے طبقات میں، الواحدی نے اسباب النزول میں، موسیٰ بن عُقبہ نے مغازی میں، ابن اسحاق نے سیرت میں اور ابن ابی حاتم، ابن المُنذِر، بزّار، ابن مَردُویہ اور طَبَرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہوا ہے وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قُرظی، عُروہ بن زُبیر، ابو صالح، ابو العالیہ، سعید بن جُبیر، ضحّاک، ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قتادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شہاب زُہری، اور ابن عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابن عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں۔ ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے اُن کا استقصاد کرنے کی کوشش کی تو ۱۵ عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپ پر القا کر دیے اور آپ سمجھے کہ یہ بھی جبریلؑ لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اُس خواہش کے زیرِ اثر سہواً آپ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپ کو اُونگھ آ گئی تھی اور اِس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپ نے یہ قصداً کہے مگر استفہام انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے

نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی شخص تھا۔

ابن کثیر، بیہقی، قاضی عیاض، ابن خزیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، قرطبی، بدرالدین عینی، شوکانی، آلوسی وغیرہ حضرات اس قصے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ "جتنی سندوں سے یہ روایت ہوا ہے، سب مُرسَل اور مُنقَطع ہیں، مجھے کسی صحیح متّصل سند سے یہ نہیں ملا"۔ بیہقی کہتے ہیں کہ "از روئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں ہے"۔ ابن خزیمہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ "یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے"۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "اس کی کمزوری اسی سے ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح متصل بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہوا ہے"۔ امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کر کے اسے بڑے پر زور طریقے سے رد کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث، اور ابوبکر جصاص جیسے نامور فقیہہ، اور زمخشری جیسے عقلیت پسند مفسر، اور ابن جریر جیسے امام تفسیر و تاریخ وفقہ اس کو صحیح مانتے ہیں اور اسی کو سورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر کا محدّثانہ استدلال یہ ہے کہ

> "سعید بن جُبیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا مُنقَطِع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریقہ سے متصلاً بسند صحیح بھی نقل ہوا ہے جسے بزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یوسف بن حمّاد عن اُمیّہ بن خالد عن شعبہ عن ابی بشر عن سعید بن جُبیر عن ابن عباس) اور دو طریقوں سے یہ اگرچہ مرسل ہے مگر اس کے راوی صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طبری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریق یونس بن یزید عن ابن شہاب۔ دوسری بطریق مُعتَمر بن سلیمان وحمّاد بن سلمہ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العالیہ"۔

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مشتبہ ہوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا استدلال

اُن لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں یا جواب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مشتبہ قرار پاتا ہو انہیں رد کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نامور صحابی اور بکثرت تابعین و تبع تابعین، اور متعدد معتبر راویانِ حدیث کی روایات سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے تو اسے صرف اس بنا پر رد کر دیا جائے کہ اُن سے آپ کا دین مشتبہ ہوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے جبکہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ ناقابل قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو، یا قوی ہوتی۔

پہلی چیز خود اُس کی اندرونی شہادت ہے جو اُسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ اُولیٰ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین میں سے ایک گروہ مکہ واپس آگیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔

—— ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ھ بعدِ بعثت میں واقع ہوئی اور مہاجرین حبشہ کا ایک گروہ مصالحت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اُسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکے واپس آگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ھ بعدِ بعثت کا ہے۔

—— سورۂ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی معراج کے بعد اُتری ہے اور معراج کا زمانہ معتبر ترین روایات کی رو سے ۱۱ھ یا ۱۲ھ بعدِ بعثت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

—— اور سورۂ حج کی آیت ۵۲، جیسا کہ اس کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے، ۱ھ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو القائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان نو (۹) سال بعد؟

پھر اس قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۂ نجم میں ہوئی تھی اور اس طرح ہوئی کہ ابتداء سے آپ اصل سورہ کے الفاظ پڑھتے چلے آرہے تھے، یکایک مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچ کر آپ نے بطور خود یا شیطانی اغواسے یہ فقرہ ملایا، اور آگے پھر سورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفارِ مکہ اسے سُن کر خوش ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اختلاف ختم ہوگیا۔ مگر سورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں ذرا اِس الحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:-

"پھر تم نے کچھ غور بھی کیا اِن لات اور عُزّٰی پر اور تیسری ایک اور (دیوی) مناۃ پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ کیا تمہارے لیے تو ہوں بیٹے اور اُس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آگئی ہے۔"

دیکھیے اس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ واقعی تمہاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر ان پر چوٹ کی جاتی ہے کہ بے وقوفو، یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمہیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصّے میں آئیں بیٹیاں۔ یہ سب تمہاری من گھڑت ہے جسے خدا کی طرف سے کوئی سندِ اعتبار حاصل نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اِس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مردِ عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پاکر یہ الفاظ زبان سے نکلوا دیے تھے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اسے سُن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا کہ بعد کے فقروں میں اِن تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سُن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اِس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سننے کے بعد یہ پکار اٹھے ہوں گے کہ چلو آج ہمارا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اختلاف ختم ہوگیا ہے؟

یہ تو ہے اس فقرے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لغو اور مہمل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔

اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نزول بیان کی جا رہی ہے آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصے میں بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو ۵ سنہ بعد بعثت میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعہ کی توجیہ سورۂ حج کی آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہوگی یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جب آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یوں ہی ڈالے رکھا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اس میں لاکر چپکا دیا گیا۔ پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی سال تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نزول تک اسے کہیں چسپاں نہ کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعہ کے چھ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی تو علاوہ اس بے تکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جا رہی ہو اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق و سباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رکوع پڑھ کر دیکھیے اور اس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعہ پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے (قطع نظر اس سے کہ آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں اور آیت کے الفاظ کفار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق)؟ اسی طرح سورۂ حج پڑھ کر دیکھیے۔ آیت ۵۲ سے پہلے کا مضمون بھی پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سیاق و سباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آ گیا کہ "اے نبی ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہوگئی تھی اس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیا سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیاء اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کر کے اپنی آیات کو پھر پختہ کر دیتا ہے۔"

ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک متشکک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جب کہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال آسکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرمابیٹھیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریل کے ساتھ شیطان بھی آپ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے اور آپ اس غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریل ہی لائے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اِس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتصال یا راویوں کی ثقاہت یا طُرقِ روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اُس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اِس قصے کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے تو نبیؐ اور قرآن پر اتنا بڑا بہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعے سے، جن میں بعض بڑے نامور ثقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پاگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا۔ اور یہ

کوئی تعجب کی بات نہ تھی - اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُر تاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک مُلہمانہ شان کے ساتھ ادا ہونا، اس کو سُن کر اگر پورے مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو، اور آپ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے - یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے - البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تاثر پر کچھ پشیمان سے ہوئے ہوں گے اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اِس فعل کی یہ توجیہ کی ہوگی کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے اس لیے ہم بھی اُن کے ساتھ سجدے میں گر گئے تھے[1] دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حَبَشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہوگئی ہے کیونکہ دیکھنے والوں نے آپ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا - یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرین سب یا ان میں سے اکثر مکے واپس آگئے - ایک صدی کے اندر یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اس سجدے کی یہ توجیہ، اور مہاجرین حبشہ کی واپسی، مل جل کر ایک قصّے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہوگئے - انسان آخر انسان ہے - بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسااوقات لغزش ہو جاتی ہے اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے - عقیدت میں بے جا غلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں - اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انھیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو اُن کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذرِ آتش کر دینے کے لائق ہے -

واپس آنے والے مہاجرین پر کیا گذری اہلِ مکّہ کے مسلمان ہونے کی خبر سُن کر شوال ۵ھ بعدِ بعثت میں مہاجرین حبش سے مکہ کی طرف واپس ہوگئے - ابن سعد کا بیان ہے کہ سب واپس آگئے، اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض

[1] یاقوت نے مُعجَم البُلدان میں لفظ عزّیٰ کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ قریش کے لوگ کعبے کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: وَاللّات والعُزّیٰ، ومَنوٰۃ الثالثۃ الاخریٰ، فانہن الغرانیق العُلیٰ، وان شفاعتہن لَتُرتجیٰ - اس سے یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ حضورؐ کی زبان سے لات و عزیٰ کا ذکر سنتے ہی کسی شخص نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے ہوں اور دُور سے سُننے والوں کو اس سے غلط فہمی لاحق ہوئی ہو -

وہیں ٹھیرے رہے۔ بلاذری نے نہ صرف یہ کہ پہلی ہجرتِ حبشہ کے تمام مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کی پوری فہرست دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ کون کس کی پناہ میں داخل ہوا۔ مکہ کے قریب پہنچے تو بنی کنانہ کا ایک شخص ملا جس سے انہوں نے قریش کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے معبودوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا تو لوگ ان کے ساتھ ہو گئے، پھر وہ ان کے معبودوں کی حسب سابق بُرائی کرنے لگے تو لوگ بھی پہلے کی طرح ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگے، اور ہم نے اسی حال پر ان کو چھوڑا ہے"۔ اس پر مہاجرین نے باہم مشورہ کیا کہ حبش کی طرف پلٹ جائیں یا اب واپس آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ مکہ میں داخل ہو جائیں؟ پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہوا، سوائے ابن مسعودؓ کے کہ وہ بلا جوار داخل ہوئے اور کچھ مدت ٹھیر کر حبش واپس چلے گئے۔ ابن مسعودؓ کے متعلق یہ بات ابن سعد اور بلاذری اور بعض دوسرے لوگوں نے لکھی ہے، مگر ابن القیم نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ مکہ ہی میں ٹھیرے رہے، اور ابن اسحاق کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس ہجرت میں گئے ہی نہ تھے۔

بلاذری نے تفصیل بیان کی ہے کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت واپس آنے والے مہاجرین میں سے کس نے قریش کے سرداروں میں سے کس کی پناہ حاصل کی تھی:-

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفّان	کو پناہ دینے والا	ابو اُحَیحہ سعید بن العاص
۲۔ حضرت ابو حُذیفہؓ بن عُتبہ بن ربیعہ	" "	اُمیّہ بن خلف
۳۔ حضرت زبیرؓ بن العوام	" "	زَمعہ بن الاسود
۴۔ حضرت مُصعبؓ بن عُمیر	" "	نضر بن الحارث بن کلدہ (یا ابو عزیز بن عمیر)
۵۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف	" "	اَسود بن عبد یغوث
۶۔ حضرت عامرؓ بن ربیعہ	" "	عاص بن وائل سہمی
۷۔ حضرت ابو سبرہؓ بن ابی رُہم	" "	اَخنس بن شریق
۸۔ حضرت حاطبؓ بن عمرو	" "	حُوَیطب بن عبد العزّیٰ
۹۔ حضرت سُہیلؓ بن بیضاء	" "	اُن کے قبیلے کا کوئی شخص (اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ کچھ دن مکے میں چھپے رہے، پھر حبش واپس چلے گئے)

بلاذری نے واقدی کے حوالہ سے، اور کچھ اختلافات کے ساتھ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے ولید بن مُغیرہ کی پناہ لی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمانوں پر سخت

ظلم ہو رہے ہیں اور وہ ولید کی پناہ میں آرام سے چل پھر رہے ہیں تو انہیں اس پر شرم محسوس ہوئی اور وہ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ میرا ایک مشرک کی پناہ میں رہنا، جبکہ میرے ساتھی اہلِ دین مصائب میں مبتلا ہیں، میرے نفس کی بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ ولید کے پاس جا کر انہوں نے کہا "آپ مجھے اپنی پناہ سے بری کر دیجیے۔" اُس نے کہا "بیٹا، کیا تم نے میری پناہ میں بھلائی کے سوا کچھ اور دیکھا ہے؟ کیا کسی نے تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے اس کے جواب میں کوئی شکایت نہیں بیان کی، بس یہ کہا کہ "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اُس کے سوا کسی دوسرے کی پناہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔" ولید نے کہا "تو پھر حرم میں چل کر اُسی طرح میری پناہ سے براءت کا اعلان کرو جس طرح میں نے اپنی پناہ کا اعلان کیا تھا۔" حضرت عثمانؓ بخوشی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ولید اور وہ ایک ساتھ حرم میں گئے۔ ولید نے کہا "یہ عثمان میری پناہ واپس کرنے کے لیے آئے ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں نے ولید کی پناہ کو ایک شریف اور باوفا آدمی کی پناہ پایا ہے۔ مگر میں اب اللہ کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا، اس لیے ان کی پناہ میں نے واپس کر دی ہے۔" اُسی زمانے میں عرب کا مشہور شاعر لَبید بن ربیعہ مکہ آیا اور اپنے اشعار سُناتے ہوئے اُس نے یہ مصرع پڑھا:

اَلَا کُلُّ شَیءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

خبردار رہو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے

حضرت عثمانؓ بن مظعون پکار اُٹھے، "تم نے سچ کہا"۔ پھر اس نے جب دوسرا مصرع پڑھا۔

وَکُلُّ نَعِیمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

تو انہوں نے کہا: "یہ جھوٹی بات ہے، جنت کی نعمت زائل ہونے والی نہیں ہے۔" لَبید اس پر بگڑ بیٹھا اور قریش کے لوگوں سے کہنے لگا، "خدا کی قسم، آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی موجب ننگ و عار نہیں رہا ہے، اور نہ بدتمیزی آپ لوگوں کی شان رہی ہے۔" اس پر بنی مُغیرہ میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر حضرت عثمان کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا جس سے اُن کی آنکھ نیلی ہو گئی۔ ولید نے طنز کے انداز میں ہنس کر اُن سے کہا "بیٹے، اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟" انہوں نے جواب دیا "میری دوسری آنکھ بھی اسی چوٹ کی محتاج ہے جو اس کی ساتھی کو لگی ہے۔" ولید نے کہا "تم ایسے ذمہ میں تھے جو تمہاری حفاظت کرنے والا تھا۔" انہوں نے کہا

"خدا کی قسم، اب میں اللہ کی پناہ کے سوا اور کسی کی پناہ نہ چاہوں گا"۔ اسی گفتگو کے دوران میں عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ نے اُس شخص کی ناک توڑ دی جس نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کو تھپڑ مارا تھا۔

ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ نے اپنے ماموں ابوطالب کی پناہ لی، کیونکہ وہ اُن کی بہن برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس پر بنی مخزوم نے جا کر ابوطالب سے کہا "اپنے بھتیجے کو تو آپ نے اپنی پناہ میں لے رکھا ہے، مگر ہمارے آدمی سے آپ کا کیا واسطہ کہ اُسے آپ پناہ دے رہے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا " محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا بھتیجا ہے تو ابو سلمہ میرا بھانجا ہے۔ اگر میں اپنے بھتیجے کو پناہ دے سکتا ہوں تو اپنے بھانجے کو کیوں نہیں دے سکتا"؟ بنی مخزوم نے کچھ جھگڑا کرنا چاہا تو ابولہب نے اُٹھ کر کہا کہ " اے اہل قریش، تم نے شیخ کے ساتھ بہت کچھ کر لیا، اور تم برابر اُن پر دباؤ ڈالتے چلے جا رہے ہو کہ اپنی قوم میں جس کو وہ پناہ دیں اس کو ان کی پناہ سے نکالو۔ خدا کی قسم، یا تو تم ان کو تنگ کرنے سے باز آجاؤ، نہیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا"۔ بنی مخزوم ابولہب کی یہ بات سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے کہا اے ابو عُتبہ، ہم تم کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

طبری نے لکھا ہے کہ واپس آنے والوں میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان اور ان کی بیوی حضرت رُقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابو حذیفہؓ اور ان کی بیوی سہلہؓ بنت سُہیل بن عمرو مکہ ہی میں رہ گئے اور مدینہ کی ہجرت تک وہیں مقیم رہے۔ لیکن یہ بیان مشتبہ ہے، کیونکہ ابن اسحاق نے دوسری ہجرت حبشہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام ۳۳ مردوں اور آٹھ عورتوں کی اُس جماعت میں بھی شامل کیا ہے جو حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے حبش سے مکہ آئے تھے، جن میں سے دو کا انتقال ہو گیا، سات قید کر لیے گئے اور ۲۴ نے جنگ بدر میں حصہ لیا۔

(باقی)